خالد محمود
اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور

علی گڑھ تحریک: درست تعبیر کا مسئلہ

Sir SayyadAhamad Khan and his movement of Aligarh have been the target of many allegations. One particular School of thought accused him of being a stooge of the English whereas the rival School exonerated him and his movement of all such charges. Time also proved the stance and the statement of the latter group. As a matter of fact, this perception is quite reasonable and stands proven that Sir Sayyad Ahmad Khan was a leader in the true sense with remarkable foresight. He perceived that imperial forces could only be tackled intellectually, not physically and history stands witness that most of the leaders who steered the Pakistan movement were from Aligarh Movement. This article thus argues for Sir Sayyad's vision.

برعظیم کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی مغلیہ یا مسلم شکست کو کئی طرح یاد کیا جاتا ہے۔ کچھ مؤرخین اس واقعہ کو جنگِ آزادی کہتے ہیں، ایک گروہ اِسے ۱۸۵۷ء کا غدر کہتا ہے اور ایک جماعت اِسے بغاوتِ ہند سے تعبیر کرتی ہے۔ نام خواہ کچھ بھی دیا جائے، لیکن یہ بات مسلّمہ ہے کہ اس واقعے نے ہندستان کے مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ اس دھرتی کے تمام افراد کو نئے شناخت نامے تھما دیے۔ اپنے ملک کی حفاظت میں لڑنے والے باغی کہلائے اور نوآبادکاروں کا ساتھ دینے والے معززین اور اَکابر ٹھہرے۔ بہرحال واقعات ۱۸۵۷ء نے ہندستانیوں کے دماغوں پر اَن مِٹ نقوش چھوڑے۔ ان حالات کی بازگشت ہمیں آج بھی سنائی دے رہی ہے بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ یہ بازگشت سے بہت کچھ زیادہ ہے۔ ۱۸۵۷ء میں ہوا کیا تھا؟ اس عرصے کی حشر سامانیوں کے کچھ مناظر ملاحظہ فرمایئے:

> میجر ہڈسن نے شہزادوں کو رَتھوں پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ سواروں کے محاصرے میں رَتھ دِلّی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب دِلّی ایک میل رہ گئی، تو رَتھوں کو روک لیا گیا۔ شہزادوں کو حکم دیا گیا کہ وہ رَتھوں سے باہر نکل آئیں اور شاہی لباس کو اُتار دیں۔ شہزادے رَتھوں سے اُترے۔ انھوں نے شاہی لباس (بالائی پوشش) اُتار دیا۔ میجر ہڈسن نے ایک سوار سے بندوق لے کر تین فائر کیے۔ تینوں شہزادے زمین پر گرے، تڑپے اور مر گئے۔ میجر ہڈسن شہزادوں کی لاشوں کو لے کر دِلّی پہنچا اور ان لاشوں کو کوتوالی پر لٹکا دیا۔ دِلّی میں یہ بات مشہور ہے کہ میجر ہڈسن نے شہزادوں کو قتل کرنے کے بعد ان کا خون پیا تھا۔۔۔ شہزادوں کی لاشیں چوبیس گھنٹے کوتوالی پر لٹکی رہیں۔ شہزادوں کے سر کاٹ کر میجر ہڈسن نے انھیں بہادر شاہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ آپ کی نذر ہے، جو بند ہوگئی تھی اور جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے آپ نے باغیوں کا ساتھ دیا۔''[1]

انگریز فوجی افسر کا یہ سلوک تو شاہی خاندان کے چشمان و چراغ سے تھا۔ کہ ان سے'' باغیانہ جرائم'' سرزَد ہوئے تھے اور انگریز اس بغاوت کی''سزا'' دے رہا تھا۔ اگر بات یہاں تک ہی رہتی تو خوف کی حالت یقیناً مختلف ہوتی، اورعوام الناس یہ سوچ کر جینے کی کوئی راہ نکال لیتے کہ یہ حکمرانوں کی جنگ ہے اور جنگوں میں ایسے واقعات عام طور سے دیکھنے میں آتے رہے ہیں۔ لیکن جب سزاؤں اور عبرت ناکیوں کا سلسلہ عوام کی گردنیں بھی کاٹ لے گیا، تو ایسے میں عوام کے دلوں میں خوف جاگزیں ہونا لازمی امر تھا۔ انگریز''باغیوں'' کوسرِعام سزائیں دے رہے تھے، اس کی وجہ اور کیا ہوسکتی تھی کہ وہ عام ہندستانیوں کو یہ باوَر کروانا چاہتے تھے کہ؛ دیکھو ہم سے بغاوت کرنے کا انجام ....اگر کوئی ہمارے خلاف سازش کرے تو ہم اس کا سر کاٹ ڈالیں گے اور اگر کسی نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھائے تو اُس کی لاش اُٹھانے والے بھی نہیں بچیں گے۔ یہ نوآبادکاروں کی اپنی طاقت کی نفسیات کا اظہار تھاجس کے ردِّعمل میں عام افراد کا سماجی سطح پر مایوسی کا ڈھیر ہوجانا بھی فطری تھا۔شاہی خاندان کے بعد'انگریز کا عام افراد سے سلوک بھی ملاحظہ فرمایئے، اورغور کیجیے کہ ایسی صورتِ حال میں'مقامی سطح پر کون انگریز سے ٹکرانے کا سوچ سکتا تھا:

> کوچہ چیلاں میں انگریز سپاہی حکیم فتح اللہ خاں کے زنانہ میں داخل ہوگئے۔اُن کی نیّت ظاہر ہے۔حکیم فتح اللہ خاں نے ایک انگریز سپاہی کو جو پیش پیش تھا، زخمی کر دیا۔اس پر انگریزی فوج کے افسرِ اعلیٰ کے حکم سے کوچہ چیلاں کے تمام مردوں کو گولی سے اُڑا دیا گیا۔ان مقتولوں میں مولانا صہبائی اور اپنے زمانے کے نامور خطاط سیّد محمد امیر بھی تھے۔تڑپ تڑپ کر مرنے والوں اور خاک و خون میں لپٹے ہوئے شہریوں کا نظارہ سپاہیوں کے لیے ایک کھیل تھا۔لیفٹیننٹ (بعدمیں لارڈ) رابرٹس اس نظارے کو اس طرح پیش کرتا ہے:''ہم لاہوری دروازے سے ہوتے ہوئے چاندنی چوک گئے تو ہمیں دِلّی مُردوں کا شہر دکھائی دیا۔چاروں طرف خاموشی تھی۔ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے یہ خاموشی ٹوٹتی۔ہم کسی زندہ انسان کی صورت نہ دیکھ سکے۔ہر طرف مُردے ہی مُردے تھے۔ زمین مُردوں کا بچھونا بنی ہوئی تھی۔ چلتے وقت ہم آہستہ آہستہ باتیں کرتے۔ڈر تھا کہ کہیں ہماری آواز سے مُردے چونک نہ پڑیں۔ایک طرف نعشوں کو کتّے کھا رہے تھے اور دوسری طرف گدھ انھیں نوچ رہے تھے۔بعض مُردوں کے ہاتھ اُوپر اُٹھے ہوئے تھے۔یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کو اشارے کر رہے ہیں۔ہماری طرح ہمارے گھوڑے بھی اُنھیں دیکھ کر ڈرتے تھے۔''چاندنی چوک کے سامنے ایک حوض کے تین طرف پھانسیاں دی جاتی تھیں اور ایک طرف تماشائیوں کے لیے کرسیاں بچھی ہوتی تھیں۔تیسرے پہر اِدھر بینڈ بجتا اُدھر لال قلعے سے مجرموں کی قطار روانہ ہوتی۔ان کے ہاتھ پیٹھ کی طرف بندھے ہوتے تھے۔ مجرموں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا جاتا۔ان میں سے آدھے پھانسی پر لٹکا دیے جاتے اور آدھے موت کے انتظار میں کھڑے رہتے۔[۲]

انگریزوں نے ہندستان فتح کرنے کے بعد دِلّی میں ایسی دل دہلا دینے والی اور خون رَگوں میں جما دینے والی دہشت ناک کارروائیاں کیں، جن کو دیکھنے والے دیوانے ہوگئے اور سننے والے ہوش کھو بیٹھے تھے۔کسی بھی مزاحمت یا آزادی کی تحریک چلانے کے لیے جس قوت اور ذہنی توازن کی ضرورت ہوتی ہے ،وہ ہندستان کے عام طبقوں میں مفقود ہوکر رہ گیا تھا۔ ہر باشعور فرد اپنی طاقت آزمانے سے پہلے اپنے مخالف کا تجزیہ ضرور کرتا ہے۔ دیوانہ وارلڑنے کا انجام تو پہلے ہی دیکھا جا چکا تھا اور یہاں تو ابھی ان حوادث کے وجود سے تازہ خون رِس رہا تھا۔

انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے ہندستان پرقریب ایک صدی پہلے سے ہی قابض چلے آرہے تھے ۔ اس دوران انھوں نے ہندستانی سماجی نظام بدل کر، اپنا انتظامی ڈھانچا نافذ اورمضبوط کرلیا۔ برطانوی مفاد کے لیےفکر پیدا کرنے والی تعلیم رائج کی اور اس کے لیے سکول سے لے کر یونیورسٹی تک ادارے قائم کیے۔ ان انگریزی اداروں میں ، انگلستان او رعیسائیت کے حق میں تعلیم دی جاتی اور ایسے اَذہان تیار کرنے کی سعی کی جاتی جوسماج میں ایسے تمام عناصر سے ٹکرانے کو تیار رہیں' جوانگریز مخالف سوچ کے حامل ہوں ۔ ریلوے کے نظام سے برعظیم کی ہزاروں میل دوری تک اپنی فوجی نقل وحرکت کویقینی بنایا گیا۔ بندرگاہوں سے منڈیوں تک اور شہروں سے چھاؤنیوں تک ریلوے کی پٹڑی اس طرح بچھائی گئی کہ کسی وقت بھی ہراس علاقے میں فوجی نقل وحرکت کی جاسکے' جہاں محسوس ہوکہ کوئی انگریز مخالف کارروائی ہورہی ہے یا اس کے ہونے کا کوئی بھی خدشہ ہے ۔ دور نزدیک انگریز مخالف قوتوں پر نظر رکھنے اور ان کی سرکوبی کے لیے ایک طاقتور فوج تیار کرلی گئی' جس میں شامل افسران تو خودانگریز تھے جب کہ نچلے درجے کے فوجی یا سپاہی ہندستانی اور دیسی باشندے تھے ۔گولی چلا نے سے لے کر لاشوں کوگھسیٹنے اور چوراہوں میں لٹکانے تک' کے عمل میں یہی سپاہی اورفوجی کارگر ہوتے' اس طرح مقامی غلام باشندوں کوان کے اپنے لوگوں پر استعمال کیا جاتا تھا ۔

اس طرح اخبارات اور چھاپے خانوں سمیت جتنے بھی ادارے یا شعبے برطانوی راج میں یا ایسٹ انڈیا کمپنی کی زیرنگرانی و سرپرستی' قائم ہوئے وہ صرف برطانوی مفاد کے لیے تھے ۔'' گورے'' کوکالے اور غلام ہندستانی ، بھوک او رافلاس کے مارے ہوئے باشندے سے کیا رغبت ہوسکتی تھی؟ ان حالات نے برّعظیم میں دوطرح کےفکری گروہوں کوجنم دیا۔ ایک وہ ذہن جو انگریز کی آمد کو اچھے نتائج سے جوڑکر دیکھ رہا تھا اور انگریز کے ہرعمل کوترقی اور کامیابی سے تعبیر کررہا تھا۔ یہ ذہن یا تو کمزور اور خوف زدہ تھا یا خود انگریزی اداروں کے زیرسایہ تربیت یافتہ تھا' اس لیے ہر دوطرح سے یہ ذہن انگریز مخالف نہیں تھا۔ اوّل الذکرصورتِ حال میں وہ ہندستان میں انگریز سے ٹکرانے اور اس کے نتائج بھگتنے کے قابل نہ تھا اورمؤخرالذکر تو انگریزی فکر کا ہی پروَردہ تھااس لیے اس کی سوچ سے انگریز کی مخالفت کا کوئی خدشہ تو ہرگز نہ تھا البتہ، وہ انگریزی فکر کے پرچار اور پھیلاو میں انگریزی مفاد میں بھی تھا۔ ان میں زیادہ تر تعداد نئے سرمایہ داروں کی اولاد اور انگریز سے مراعات یافتہ جاگیرداروں کی تھی ۔ اس طبقے کی حفاظت کی ذمہ داری ایک طرح سے انگریز کی ہی تھی اور بدلے میں یہ طبقہ انگریز کے وفادارا ذہان کو بڑھا وا دے رہا تھا ۔اس طرح انگریز اور انگریز کے وفادار دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے اور یہ تعلق مفاد پر قائم تھا ۔

دوسری طرف ہندستان کی سرزمین کو اپنی ماں کہنے اور اس کی وفاداری اور حفاظت میں کٹ مرنے والا ذہن تھا۔ یہ ذہن گلی محلے ، عام بازاروں ،تھڑوں، دیہات حتیٰ کہ انگریزی فوج کے دیسی سپاہیوں میں بھی موجود تھا۔ یہ ذہن کسی خاص مقصد کے تحت پیدا کردہ وقتی صورت حال سے نپٹنے کے لیے تیارنہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کی رگوں میں ہندستانی دہقاں کا گرم خون اور فطری جذبۂ حریت تھا' یہ جذبہ راتوں رات پروان نہیں چڑھا تھا' یہ ایک تسلسل کے ساتھ،نسل درنسل اس زمین پر پیدا ہوا تھا اور اس زمین میں دفن تھا گویا یہ ذہن (یہاں ذہن اورفکر ہم معنٰی ہیں) خالصتاً اسی دیس کا تھا' اس لیے ،اس کی وفاداری کوعبادت کا درجہ حاصل تھا۔ برّعظیم کی محبت نے یہاں مختلف اعتقاد اور مذہب کے لوگوں کو ایک کردیا تھا اور وہ اپنے فطری تضادات سے نکل کر معاشرتی اکائی میں بدل چکے تھے ۔

انگریز بہادر کو مؤخرالذکر ذہن سے خوف تھا کہ یہ کسی بھی وقت حبّ الوطنی میں پلٹ کر وار کرسکتا تھا۔ اس لیے لازمی امر تھا کہ اسے اپنی مدافعت کے لیے بھی ایسے دیسی ،حفاظتی حصار کی ضرورت تھی جو اس کے خوف کو کم کرسکے ۔ اس کے بدلے انگریز اس طبقے پر اپنی عنایات ، مراعات اور قربت کی رونقیں اور خوشیاں بانٹ رہا تھا۔ اس طرح دونوں طبقوں کے مابین حدِّ فاصل جو پہلے بھی قائم تھی مزید واضح ہو کر سامنے آئی ۔ وہ حدِّ فاصل جو مراعات یافتہ اشرافیہ اور بھوک افلاس کے مارے غلاموں کے درمیان ہوتی ہے ۔ یہ حدِّ فاصل انیسویں صدی کے وسط میں اپنے عروج پر تھی ۔

افلاس زدہ ، بھوکے ، سیاہ غلاموں کا مراعات یافتہ انگریز کے پروردہ اور ان کے آقاؤں کے درمیان ٹکراو یقینی ہورہا تھا جو ۱۸۵۷ء میں رونما ہوگیا۔ اس ٹکراو میں مغلیہ فرمانروا بہادر شاہ ظفر کو شکست نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ دو مختلف اذہان رکھنے والی قوتوں کا ٹکراو تھا ۔ دونوں کی بقا کا مسئلہ تھا ۔ بہرحال اس میں بہادر شاہ ظفر اوران کے حریت پسندوں کو شکست ہوئی اور قابض اور ان کے وفادار جیت گئے ۔ بہادر شاہ کو رنگون جلاوطن ہونا پڑا اور ان کے بیٹوں کو سزائے موت بھگتنا پڑی ۔ ان کے اتحادیوں کو فاتحین (قابضین) سے یقینی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ زندگی ،املاک ،عزت گویا ہر شے داؤ پر لگی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد فاتحین سرخوشی میں ڈوبے تھے جب کہ شکست خوردہ مایوسی کے اندھے گڑھوں میں جا گرے تھے ۔ ذلیل ورسوا ہونے کی جس سطح کا سامنا اس طبقے کو اس عرصے کے دوران ہوا وہ برّعظیم کی تاریخ میں شاید ہمیں کہیں اور نہیں ملتا ۔

موجودہ صورتِ حال میں ایک طبقہ سزا یافتہ تھا' جس کا ایک بڑا حصہ شکست کے بعد کہیں رُوپوش تھا اور دوسرا فاتحین کا بغل بچہ بن کر مستقبل میں حکمرانی کے سہانے خواب دیکھ رہا تھا۔ اتنی بڑی آبادی میں اس قدر شکست وریخت کے بعد ایک تیسرا طبقہ بھی تھا جو پہلے پہل تو خاموش رہا، البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد اس طبقے نے حکمتِ عملی مرتب کی اور مصلحتاً انگریز کے ساتھ جڑ گیا، تاکہ مستقبل کی کوئی صورت پیدا کرسکے ۔ کیوں کہ اس تیسرے طبقے کو ایک خوف نے آن گھیرا تھا اور وہ یہ تھا کہ؛ عوام کی اکثریت چوں کہ انگریز کے ساتھ مل چکی تھی ، اس لیے شاید مستقبل کے تمام فیصلے اکثریت کے حق میں ہوں ۔ اگر مذکورہ خدشہ حقیقت ہوتا، تو پھر اِسے اپنی اَبدی ناکامی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اِس تیسرے طبقے کے پیشِ نظر ذاتی مفادات ہرگز نہ تھے' بلکہ قومی بقا کی خاطر یہ کوئی راہ نکالنا چاہتا تھا۔

اس طبقے میں سرسیّد احمد خان ایک نہایت اہم اور مؤثر نام ہے ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تاریخ میں سرسیّد کو جو اہمیت اور خاصیت حاصل ہے اس کی وجہ ان کی اپنی عملی شخصیت ہے ۔ سرسیّد اپنی فکر، استدلال اور مشکل حالات کے اہم ترین فیصلوں کی وجہ سے متنازع ترین شخصیت بھی ہیں ۔ مفکرین کا ایک گروہ انھیں انگریز کا ''پٹھو'' تک کہتا ہے ۔ جب کہ ،دوسرا گروہ انھیں ہندستان میں مسلمانوں کی نِشاۃ ثانیہ کا بانی وراہنما قرار دیتا ہے ۔ دونوں فکری حلقوں کے پاس اپنے اپنے دلائل اور اپنی اپنی فکر موجود ہے ۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندستان کی تاریخ جس تیزی سے تبدیلی کی مراحل سے گزری اس نے کچھ ہی عرصے میں سب کچھ تہ و بالا کر کے رکھ دیا ۔ لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ، مقامی سطح پر انگریز کے خلاف مزاحمت سے جو عوام کے جانی ومالی نقصانات ہوئے تھے، ان نقصانات کی وجہ سے اس مزاحمت کے طریقے کار پر متاثرین جنگِ آزادی اور ان کے ورثا کو تحفظات تھے ۔ بہرحال ایک بکھرتی ہوئی قوم کو یکجا کر کے ،کسی طور ، مستقبل کے تعین کے لیے کسی مناسب راہ پر لے چلنا بلا شبہ سرسیّد کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ اس

ساری صورت حال کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ سرسیّد کا انگریزوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ ہندستانی سماج اور خاص کر مسلمانوں کے لیے کس قدر اہم اور کارگر ثابت ہوا، یہ مباحث گزشتہ ڈیڑھ صدی سے جاری ہیں ۔

مذکورہ حوالے سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ سرسیّد کو کس تکلیف دِہ صورتِ حال کا سامنا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انگریز کی سرپرستی میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کوششیں شروع کیں۔۱۸۳۵ء سے انگریز نے ہندستان میں انگریزی کی تعلیم کو لازمی قرار دے رکھا تھا ، جس کی مسلمان مخالفت کرتے چلے آرہے تھے جب کہ باقی اقوام اس سے فوائد حاصل کرنے میں کامیاب تھیں‘ یہ مشاہدہ سرسیّد کے سامنے بھی تھا۔سرسیّد شروع میں مقامی زبانوں میں ہی تعلیم کی تدریس کے حامی تھے ، لیکن انھوں نے جلد ہی بھانپ لیا تھا کہ ان کا یہ مقصد کامیابی سے ہم کنار ہونے والا نہیں، کیوں کہ انگریز اپنی زبان کی اشاعت اور پھیلاو میں دلچسپی رکھتا اور باقی اقوام کی اسے تائید حاصل بھی تھی۔ایسے میں وقت ایک ہی تقاضا کر رہا تھا کہ کج بحثی سے اجتناب کرتے ہوئے مصلحت کی راہ کو اپنایا جائے۔ سرسیّد نے ایسا ہی کیا اور مسلمانو ں کی انگریزی تعلیم کے لیے راہ ہموار کرنی شروع کردی۔’’ سائنٹفک سوسائٹی‘‘ اسی لیے قائم کی گئی اور اس سوسائٹی کے زیرِ انتظام کئی انگریزی اور دیگر غیر ملکی زبانوں کی کتب کے تراجم بھی کیے گئے۔

سرسیّد اپنی تحریر وتقریر سے ہندستانیوں کو انگریزی سیکھنے کی طرف مائل کرنے لگے ۔ اس کوشش میں انگریزی زبان کی ترویج شاید اتنا بنیادی مسئلہ نہ تھا، جتنا اہم یہ کہ ہندستانی لوگ وہ علوم سیکھیں جن کی مستقبل میں ضرورت پڑنے والی تھی یا جن کی بنیاد پر یورپی ترقی کر رہے تھے‘ سرسیّد کا ایک بیان دیکھیے :

> گورنمنٹ نے ہمارے لیے سول سروس میں داخل ہونے کا راستہ گو اُس میں کیسی ہی مشکلات پڑ گئی ہوں ابھی تک کھلا رکھا ہے ۔ بیرسٹری کی سند، ڈاکٹری کا ڈپلومہ ، انجینئری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے کوئی اَمر، ہم کو مزاحم نہیں ہے۔ ہندوستان میں انڈین سول سروس کے عہدے کو جس میں ہماری بدبختی سے ابھی تک چنداں قابلیت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے ، جانے دو ،مگر ہائی کورٹ کی ججی حاصل کرنے سے ہماری امید یں ابھی منقطع نہیں ہوئی ہیں۔ ہندوستانیوں کا کونسل قانونی میں داخل ہونا ابھی تک بند نہیں ہوا ہے ۔’’ ہم کو سمجھنا چاہیے کہ ان حقوق کے واجبی طور سے حاصل کرنے کے لیے ہم کو کیا کرنا ہے ؟ کیا مشرقی مردہ علوم کو زندہ کرنے والی یونیورسٹی؟ کیا ہماری پرانی شایستگی کو پھر ہمارے لیے مہیا کرنے والی تجویز؟ معمولی عہدے بھی جیسی وکالت ومنصفی وسب ججی ہے ،بغیر انگریزی زبان کی لیاقت کے ہم کو میسر نہیں آسکتی۔ پھر کیا مردہ علوم مشرقی کے زندہ ہونے اور ہماری مشرقی زبانوں کی ترقی سے ہم کو کچھ نتیجہ مل سکتا ہے ۔ یونیورسٹی کالج لاہور جو پوری یونیورسٹی ہونے والا ہے بجز اس کے کہ ہم کو سیدھی راہ سے چلنے سے روکے ، ہم کو ہمارے حق سے محروم رکھے ، ہم کو اس لائق نہ ہونے دے کہ ہم اپنے حقوق کا دعویٰ کرسکیں ، ہمارے حق میں اور کیا کرسکتا ہے ؟[۳]

۱۸۵۷ء کے بعد ہندستان کی فضا خاص کر مسلمانوں کے لیے سازگار نہیں رہی تھی۔ اس بگڑی ہوئی حالت کو سازگار بنانے کے لیے جس ہمت اور استقامت کی ضرورت تھی وہ ہمیں سرسیّد کے ہاں نظر آتی ہے ۔ البتہ ان کی تحریروں اوران کے لب ولہجے پر جواعتراضات کیے جاسکتے ہیں وہ بھی کسی طور کم نہیں ہیں۔لیکن جب ہم سرسیّد کی عدم تشدد اور روادار شخصیت کو سامنے رکھ کر جائزہ لیتے

ہیں تو ہمیں خود ان کے قول و عمل میں وہ ہم آہنگی نظر آتی ہے جو آگے چل کر مسلمانان ہند کے لیے راہ نجات ثابت ہونے والی تھی ۔

سرسیّد ایک نڈر راہنما کی صورت موجود تھے اور خوف زدہ طبقہ جو ترقی کا خواہاں تھا اور انگریز سے محض لڑائی میں نہیں مارا جانا چاہتا تھا اور جس کی خواہش تھی کہ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہو جانے والی صورت حال جلد از جلد انجام کو پہنچے اور کوئی امید کی کرن پیدا ہو، وہ طبقہ بھی سرسیّد کے ساتھ آن ملا تھا اور سرسیّد کی بات اور ان کے مؤقف کی تائید کرنے لگا تھا کہ انگریز سے لڑ کر شاید یہ جنگ کبھی نہ جیتی جا سکے۔ آج تاریخ کے دانشوروں کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر ہندستان پر انگریز قابض نہ ہوتے تو مقامی قوتیں مغلیہ حکومت کو ختم کرنے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ کیوں کہ اب مقامی قوتوں کے لیے بھی ایک کمزور بادشاہی نظام کو شکست دینا آسان ہو چکا تھا ۔ ایسی مقامی قوتوں میں، سکھ، جاٹ، روہیلے، مرہٹہ فوج شامل تھی۔ کیوں کہ اورنگ زیب کی موت (۱۷۰۷ء) کے بعد سے ہی مغلیہ ولی عہدوں کے مابین لڑائیوں نے مقامی سطح پر قوتوں کو پیدا ہونے کا موقع دے دیا تھا، جس میں سید برادران ایک اہم قوت کے طور پر سامنے آئے تھے اور ہندستان کی تاریخ میں ''بادشاہ گر'' کے نام سے پہچانے جانے لگے تھے ۔

۱۸۵۷ء کے بعد کی صورت حال سب سے تقاضا کر رہی تھی کہ ہندستانیوں اور خاص کر مسلمانان ہند کی اصلاح کی جائے کہ وہ اپنے بگڑے حالات کو کسی طرح اور کسی ڈھب سے سنوار سکتے ہیں، تو سنوار لیں۔ سرسیّد اس اہم وقت میں یہ کام سرانجام دیتے نظر آتے ہیں ۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو آیندہ ترقی کرنے کے لیے ایسے علوم سیکھنے چاہئیں جو تیزی سے دنیا بھر کی ترقی یافتہ قومیں سیکھ رہی تھیں ، بصورتِ دیگر مسلمان ترقی نہ کرنے سے سیاسی اور سماجی سطح پر نہ صرف تنہا رہ جائیں گے بلکہ شاید زوال آمادہ یہ قوم بہت جلد اپنے انجام کو پہنچ جائے۔ اگرچہ مسلمانوں کے عقائد کی ترجمانی مولوی چراغ علی بھی کر رہے تھے جو کہ خود ایک جید عالم تھے۔ تاہم سرسیّد کے کندھوں پر بوجھ زیادہ تھا۔ سرسیّد اپنی ذاتی زندگی میں بھی عملی کردار کے حامل تھے اسی لیے انھوں نے اپنے مضامین ،کتابوں ،رسالے'' تہذیب الا خلاق'' ، مدرسے اور پھر کالج سے مسلمانوں کی دست گیری کا عمل شروع کیا۔ اس حوالے سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۵ء تک کا عرصہ اس حوالے سے نہایت اہمیت کا حامل ہے ۔

۱۸۵۷ء سے پہلے لکھی گئی سرسیّد کی تحریروں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ان کے موضوعات اور اسلوب کو ۱۸۵۷ء کے بعد کی تحریروں سے یکسر مختلف دیکھتے ہیں ۔ اس کی بڑی وجہ سرسیّد کا وہ نقطہ نظر ہے جو خود ۱۸۵۷ء کے بعد کی اِرتقائی شکل ہے۔ پہلے کی تحریروں میں معاشرے میں سیاسی اور مذہبی حوالے کو اس طرح پیش نہیں کیا گیا جیسے کہ ہمیں بعد کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ پہلے وہ ''آثار الصنادید'' لکھتے اور قدیمی عمارتوں کے کتبے پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر، ۱۸۵۷ء میں ان کی شخصیت میں یکسر قومیت جاگ اٹھتی ہے اور اب ان کا انداز تخاطب درمندی میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے ۔ معاشرے کی اصلاح ،مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح ، سیاسی نظریے کی اصلاح اور دوراندیشی پر مبنی استدلال قائم کرتی ہوئی تحریریں ہمیں ایک نئے سرسیّد کا پتا دیتی ہیں ۔ سرسیّد معاشرتی سطح پر پیدا ہوتی تبدیلیوں کو قبول کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ان کی تحریر ان کے عمل کی واضح تصویر بن کر ہمارے سامنے آتی ہے ،مثال ملاحظہ فرمایے:

> اب ہم کو ہندوستان کے مسلمانوں پر غور کرنا ہے ، جو بطور رَعیت کے اور مطمئن ہو کر انگلش گورنمنٹ کے ماتحت رہتے ہیں ۔ انگلش گورنمنٹ نے ان کے ساتھ عدل وانصاف کرنے میں بقدر اپنی طاقت کے کوئی دَقیقہ اٹھا نہیں رکھا ۔ ان

کے تمام معاملات کے فیصلہ کے لیے قانون بنادیئے ہیں اور ہر شخص پہلے سے جانتا ہے کہ کسی فعل کا نتیجہ وہ ہے جو قانون میں لکھا ہے ۔ مذہبی آزادی انگلش گورنمنٹ نے ہرایک قوم کو دی ہے۔ تمام مذہب والوں کے مذہبی معاملات ان کے مذہبی مسائل کے موافق عدالت سے فیصل ہوتے ہیں ۔ جان اور مال کا امن اور سوائے بغاوت اورشرارت کے ہرقسم کی آزادی انگلش گورنمنٹ کی رعیت کو حاصل ہے ..... انگلش گورنمنٹ کی رِعایا ہوکر وہ انگلش گورنمنٹ کے ساتھ کسی قسم کا فساد یا مخالفت یا بغاوت قولاً وفعلاً نہیں کرسکتے ۔[۴]

سرسیّد جان چکے تھے کہ انگریز کی حکمرانی میں معاشرتی سطح پر کیا کیا کچھ تبدیل ہوکررہ جائے گا۔ وہ ہر اس تبدیلی کے لیے مقامی باشندوں اور خاص کر مسلمانوں کو بھی تیار کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ جو انگریز کے آنے سے سماج میں رونما ہورہی ہے۔ اس میں جو قابل قبول ہے اسے قبول کرلیا جائے اور مسلمانوں کا ایک رَواداری سے بھرا تعارف ابھر کر سامنے آئے تاکہ وہ انگریز سے مکالمہ کرکے اپنے مستقبل کی راہ ہموار کرسکیں۔ سرسیّد ہندستان کو انگریزی غلامی میں جاتا دیکھ چکے تھے اور یہ امر، اظہر مِن الشّمس تھا، کہ غلاموں کو انداز غلامی تبدیل کرنا ہوگا، ورنہ وہ پرانی روش پر چل کر محض غلام ہی رہیں گے۔ غلامی سے نفرت پیدا کرنے کے لیے انھوں نے مضامین لکھے، تاکہ مسلمانوں کے دل میں ہرطرح کی غلامی کے خلاف نفرت پیدا ہو۔ پیری مریدی سے لے کر دوسری قوموں کے دست نگر ہونے تک کے غلامانہ خیالات اور رویوں کو انھوں نے موضوعِ بحث بنایا۔

سرسیّد کا خیال تھا کہ اسلام کو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ جوڑنے کے لیے ہمیں اپنے کردار اور عمل سے اِسے ایک قابلِ عمل دین ثابت کرنا چاہیے نہ کہ صرف تعلیمات کا ایک پلندہ بنا کر سنبھال رکھیں۔ اس لیے انھوں نے عملی اور تجرباتی حوالوں سے زندگی کو موضوع بنایا اور مذہب کی ایک نئی فطری تشریح اور تفسیر پیش کرکے ثابت کیا کہ اسلام غلامی کا دین نہیں ہے، چاہے یہ غلامی ذہنی ہو یا جسمانی، ہر دو سطح پر غلامی کو قابلِ نفرت ہی ہونا چاہیے۔

۱۸۶۹ء میں جب سرسیّد برطانیہ گئے تو انھوں نے انگریز قوم کا عملی سطح پر ایک قابلِ تقلید نمونہ دیکھا اور ہندستانی مسلمانوں سے موازنہ کرکے وہ اِس نتیجے پر پہنچے کہ اگر مسلمانانِ ہند کو اسی طرح عملی زندگی میں کامیاب کردیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ، یہ زندگی کے ہرمیدان میں کامیاب نہ رہیں لہٰذا اسی مقصدِ عظیم کے لیے، انھوں نے برطانیہ سے واپسی پر ایک سلسلۂ تحریر وتقریر شروع کیا۔ اسی دورے کے بعد انھوں نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کی اشاعت کا بندوبست کیا اس حوالے سے ایک اقتباس دیکھیے:

اس پرچے کے اِجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے ، تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں اُن کو دیکھتی ہیں ،وہ رَفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں۔ سویلزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا ترجمہ ہم نے تہذیب کیا ہے ۔ مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے عام اَفعال آزادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہرقسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی وہنر اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی حاصل ہوتی ہے اور ممکن وَقار وقدر ومنزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے ۔ یہ بات نہایت سچ ہے کہ کسی قوم کے مہذب ہونے میں اس قوم کے مذہب

کو بھی بڑا دخل ہے۔ بے شک بعضے مذہب ایسے ہیں کہ وہ تہذیب قومی کے بڑے مانع ہیں...یہی ہمارا مطلب اپنے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے ہے اور اسی مقصد کے لیے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تاکہ بذریعہ اس پرچہ کے جہاں تک ہم سے ہوسکے اُن کے دین دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقصان ہم میں ہیں، گوہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں ان کو بہ خوبی دیکھتی ہیں ۔ ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں ان میں ہیں اُن میں ترقی کرنے کی ان کو رغبت دلاویں : واللہ ولی التوفیق۔[۵]

سرسیّد کو امید تھی کے اس رسالے کے اجرا کے بعد مسلمان جو کہ ان کے رسالے کو پڑھیں گے یقیناً ان کے اذہان تبدیلی کی طرف مائل ہوں گے ۔ انھوں نے اپنی ادارتی تحریروں میں انگریزی زبان کے چیدہ چیدہ الفاظ استعمال کیے' تاکہ مسلمان جو انگریزی زبان سے نفرت کرتے آرہے تھے اور جس سے متعلق وقت کے مولویوں نے مضحکہ خیز فتوے جاری کررکھے تھے' مسلمانوں کو اس زبان کا کسی قدر عادی بنایا جائے۔ پہلے پہل جب انھوں نے انگریزی کے الفاظ اپنے مضامین میں برتنے شروع کیے تو ہندستان کے سطحی ذہن سرسیّد کے خلاف زہر اگلنے لگے اور یہ سلسلہ ان کی زندگی آخر تک جاری رہا،آپ خود لکھتے ہیں:

یہ تو ہم نے سنا کہ بعض لوگوں نے ہمارے پرچہ کا نام ''تخزیب الاخلاق'' اور'' تخزیب الآفاق'' رکھا ہے جس طرح کہ ایک پرانی قوم نے قولوا حطۃ نغفر لکم خطایاکم وسنزید المحسنین کی جگہ حنطۃ پڑھا تھا مگر ہم نے کوئی تحریر بہ طور ریویو کے اس پر نہیں دیکھی جس میں بہ طور ایک عادل حاکم کے اس کی بھلائی پر مفصل رائے دی ہو۔ بعض دوستوں نے ہمارے پاس خط بھیجے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری تحریر کو اور سادگی عبارت کو پسند کرتے ہیں اور ہمارے مضمونوں کو بھی عمدہ سمجھتے ہیں ۔ ہمارے ایک انگریز دوست نے ہم کو لکھا کہ '' تہذیب الاخلاق'' نے یہ ثابت کر دیا کہ اُردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہوسکتے ہیں اور یہ بھی ثابت کیا کہ مذہب اسلام ایسا تنگ وتاریک رستہ نہیں ہے جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا تھا۔[۶]

اصل میں سرسیّد انسانی زندگی اوراس کے تمام پہلوؤں کو فطری انداز میں دیکھنے کے عادی تھے اور کسی بھی جزوِعمل کو وہ غیر فطری تصور نہیں کرتے تھے' اس لیے ان کا خیال تھا کہ انسانی زندگی فطرت کے مختلف تضادات کے باوجود بھی عین فطری ہی ہے اور اسے خیالی یا قیاسی حوالے سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ فطرت کے اصولوں کے مطابق دیکھنا چاہیئے' یہی سر سیّد کا استدلال (Rationalism) تھا۔ سرسیّد کے نزدیک مذہب جو کہ انسان کی راہبری اور راہنمائی کے لیے آیا تھا وہ بھی عین فطری اصولوں پر پھیلا تھا' مختلف اَدوار میں جو غیر فطری خیالات اس میں داخل کردیے گئے تھے' سرسیّد کے مطابق وہ دین کی خدمت نہیں کررہے تھے بلکہ اس کے برعکس وہ دینِ اِسلام کے لیے ضرر رَساں تھے ۔ ہم اس عرصے میں دیکھتے ہیں کہ کس طرح سرسیّد اِن خیالات کو اپنی تحریروں کا حصہ بنا کر ہندستانیوں تک پہنچا رہے ہیں تاکہ ان کے قدیم علمِ دین سے جڑے ہوئے اَذہان میں کچھ تازہ خیالات کی روشنی داخل ہوکر ان کو منور کرے اور وہ بدلتی ہوئی صورتِ حال کا ادراک ٹھیک ٹھیک انداز میں کرکے اپنی راہ ہموار کرسکیں۔

ان کے اس جدید رجحان ساز رویے کی مخالفت پوری شدت کے ساتھ سامنے آئی اور انھیں مرتد ، کافر ، انگریز کا پٹھو، نیچری ، دَہریہ اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہا گیا' مگر یہ تمام حالات مل کر بھی سرسیّد کو اُن کے راستے سے متزلزل نہیں کرسکے ۔ سرسیّد ان شرارتوں

کو خوب سمجھتے تھے' وہ خود لکھتے ہیں:

> ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہماری قوم نے ہم سے کیا کیا کچھ نہیں کیا۔ بہت کیا تو یہ کیا کہ دو چار خط گم نام سبّ ودشنام کے لکھ بھیجے ۔ ہم نے شکر کیا کہ ہمارا تو کچھ نہیں بگڑا اوران کا دل ٹھنڈا ہوگیا۔ اس سے زیادہ کسی کو غصہ آیا اور کوئی اخبار نویس بھی اتفاق سے ان کا دوست ہوا یا دو پتھر اور ایک کاٹھ کی کل ان کے ہاتھ میں ہوئی تو انھوں نے اپنے دل کے غصہ کو جھوٹ سچ باتیں چھاپ کر یا چھپوا کر ٹھنڈا کیا۔ ہم تو اس پر بھی راضی ہیں مگر اس دن ہم کو افسوس ہے جب کہ وہ لوگ خود اپنی باتوں پر افسوس کریں گے۔ ۷

یہاں یہ پہلو بھی دل چسپ ہے کہ سرسیّد کی مخالفت سب سے زیادہ مسلمانوں نے کی۔ سرسیّد کی زندگی کے جائزے سے ہمیں یہ بات ملتی ہے کہ وہ کسی غیر معمولی ذہانت وفطانت کے مالک نہیں بلکہ ایک عام انسان کی طرح پروان چڑھتے ہیں ۔ ناقدین سرسیّد کی زندگی کو تین اَدوار میں منقسم دیکھتے ہیں ۔ ایک ان کے شعور سے ۱۸۵۷ء تک ،دوسرا ۱۸۵۷ء سے برطانیہ کے سفر تک اور تیسرا دور، برطانوی سفر کے بعد بقیہ زندگی تک ۔

بلاشبہ یہ تین اَدوار سرسیّد کی زندگی میں اہم ہیں جن میں ہم ان کی ذاتی زندگی اور شخصیت کو مختلف مدارج سے گزرتے ہوئے دیکھتے ہیں ۔ ۱۸۵۷ء سے قبل کی تحریروں کا جائزہ گزشتہ صفحات پر لیا جا چکا ہے' جس میں دیکھا گیا کہ جنگِ آزادی سے قبل کی تحریروں میں ان کا تحقیقی اور تخلیقی رجحان کس طرف راغب تھا اوران کا اندازِ تحریر کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی زندگی کا غالباً سب سے اہم موڑ شروع ہوتا ہے' جس میں وہ امن پسندی کے داعی بن کر ہندستانیوں کی بھلائی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کئی طرح کے منصوبوں پر کام شروع کرتے ہیں۔ وہ رِسالہ ''اَسبابِ بغاوتِ ہند'' لکھتے ہیں' جس میں بڑی عرق ریزی سے ۱۸۵۷ء میں پیدا شدہ صورت حال کا جائزلیتے ہیں اور ایک معروضی انداز میں اِس بغاوت کے اَسباب میں انگریز کو ذِمہ دار ٹھہراتے ہیں ۔ اِسی وجہ سے اُن کا رسالہ مذکور کو ضبط کرلیا جاتا ہے ،سینکڑوں کاپیاں جلائی جاتی ہیں' اگر اس رِسالے کو انگریز سرکار کی طرف سے' ضبط اورتلف کرنے سے پہلے' سرسیّد کی طرف سے مختلف جگہوں پر اسے ارسال نہ کردیا گیا ہوتا تو ایک امکان ہے کہ شاید یہ رسالہ تاریخِ ادبِ اردو میں موجود نہ ہوتا ۔

علمائے تاریخ کا کہنا ہے کہ علی گڑھ تحریک ۱۸۵۷ء کے حوادث سے پیدا ہوئی' دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اگر ۱۸۵۷ء میں دِلّی کا سقوط نہ ہوتا تو علی گڑھ تحریک ہمارے سامنے نہ آتی ۔ یہ بات بھی اپنے معانی میں درست ہے۔ تاریخ میں بے شمار ایسی تحریکیں ملتی ہیں جو حوادث ، المیات یا اُن کے ردِّعمل کی پیداوار ہیں۔ اکثر قوموں کی زندگی میں ایسے حالات پیدا ہوئے ہیں جن کے رَدِّعمل میں وہ اُبھر کر دنیا کے منظرنامے پر پھیل گئیں ۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء کے حوادِث نے سرسیّد کو ایک ایسی سوچ کا مالک بنا دیا تھا جس سے وہ پوری اُمّتِ مسلمہ کے زوال اوراس کے اسباب تلاش کرنے لگے' اِس دوران وہ جن نتائج تک پہنچے' ان کوانھوں نے اپنی تحریروں میں مناسب انداز سے اس لیے بیان کردیا تا کہ اسلامیانِ ہند اِن مذہبی قباحتوں سے بچ کر چلیں اور آیندہ انھیں کسی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے ۔

انگلستان کے دورے میں انھوں نے انگریزوں کی ترقی کی جو وجوہات تلاش کیں اوران وجوہات کو جو سرسیّد نے معانی دیے

وہ یہ تھے' کہ انگلستان کی ترقی کا باعث وہاں کے باشندوں کا مذہبی ہونا نہیں ہے یعنی وہاں معاشرتی ترقی کا باعث مذہب نہیں تھا بلکہ انگلستان کی ترقی انگریزوں کے سماجی رَویوں سے ممکن ہوئی تھی۔ وہ جس طرح پر امید، جفاکش، محنتی، دیانت دار، سادہ اور اپنے کام سے لگن کے مالک تھے۔ انھیں دیکھ کر سرسیّد کو اس کمی کا شدت سے اندازہ ہوا کہ یہ خاصیت ہند کے مسلمانوں میں نہیں ہے۔ اسی لیے انھوں نے انگریزی تہذیب کا بغور مطالعہ کیا اور ہندستان کی نشاۃ ثانیہ کے لیے پروگرام مرتب کرنا شروع کر دیا۔ اپنے دورۂ انگلستان کے بعد جو کچھ انھوں نے ہندستان واپس آ کر عملی سطح پر ممکن بنایا، وہ سب کچھ انھوں نے انگلستان میں دیکھ کر، وَہیں اِس فریضے کو انجام دینے کا اِرادہ کرلیا تھا۔ انھوں نے اس بات کا بھی تجزیہ کر لیا تھا کہ انگریزوں کی تہذیب و ترقی میں ان کے اشاعتی اِداروں، اَخباروں اور رسائل و جرائد نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا' لہٰذا انھوں نے اس کا بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وطن واپسی پر' وہ اسی مقصد کے پیشِ نظر ایک رسالہ جاری کریں گے جو مسلمانانِ ہند کی تہذیب و ترقی کے لیے خدمات سرانجام دے گا۔ انھوں نے اپنے اس ارادے کا ذکر نواب محسن الملک کے نام ایک خط میں بھی کیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے انگلستان سے واپسی پر رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کی بنیاد رکھی۔ جس کے اِجرا کی تحریک ان کو انگلستان کے دورے کے دِنوں میں ہوئی تھی۔ ان کو جن رسائل و جرائد کے جائزے کا موقع ملا ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> سرریچرڈ اسٹیل صاحب نے ۱۷۰۹ء میں ایک پرچہ نکالا جس کا نام ''ٹیٹلر'' تھا، اس کے اصلی ایڈیٹر تو اسٹیل صاحب تھے مگر اڈیسن صاحب بھی کبھی کبھی مدد دیتے تھے۔ یہ پرچہ ہفتہ میں تین دفعہ چھپتا تھا۔ پہلا پرچہ اس کا بارھویں اپریل ۱۷۰۹ء کو نکلا تھا۔ سرریچرڈ اسٹیل صاحب نے خود کہا ہے کہ ان کی غرض اس پرچہ کے نکالنے سے یہ تھی کہ انسان کی زندگی جو جھوٹی بناوٹوں سے عیب دار ہوتی ہے اسے بے عیب کریں اور مکاری اور جھوٹی شیخی کو مٹا دیں اور بناوٹی پوشاک کو اتاریں اور اپنی قوم کی پوشاک اور گفتگو اور برتاو میں عام سادہ پن پیدا کریں۔ اس پرچہ کے دو سو اکہتر (۲۷۱) نمبر چھپے چناں چہ اخیر پرچہ اس کا دوسری جنوری ۱۷۱۱ء کو چھپا اور پھر بند ہوگیا۔ اس کے بعد سرریچرڈ اسٹیلا اور مسٹر اڈیسن صاحب نے مل کر ایک اور پرچہ نکالا اور اس کا نام ''اسپیکٹیٹر'' رکھا تھا۔ یہ پرچہ ہر روز چھپتا تھا اور وہی دونوں صاحب اَخیر تک اس میں مضمون لکھا کرتے تھے۔ پہلا پرچہ اس کا یکم مارچ ۱۷۱۱ء کو چھپا تھا اور صرف تین سو پینتیس نمبر اس کے چھپے تھے۔ یہ پرچہ اپنے زمانہ میں بے نظیر تھا اور صرف ''ٹیٹلر'' ہی کو اس نے نہیں بھلا دیا تھا' بلکہ اس زمانہ میں جس قدر کتابیں اس قسم کی تصنیف ہوئی تھیں ان سب پر فضیلت رکھتا تھا۔ عمدہ عمدہ اَخلاق وآداب اس میں لکھے جاتے تھے۔ خویش و اقارب کے ساتھ سلوک کرنے کے عمدہ قاعدے اس میں بیان ہوتے تھے۔ اس بات کا کہ انسان اپنے اس وقت کو جس کا نام شوق ہے کس طرح دیکھ بھال اور سوچ بچار کر کر کس بات میں صرف کرے؛ نہایت عمدگی سے ذکر ہوتا تھا اور ہر ایک مضمون نہایت خوبی اور بردباری اور عجیب وغریب مذاق سے بھرا ہوتا تھا۔ یہ پرچہ اس لیے بھی انتہا تعریف کا مستحق ہے کہ اس نے طرزِ تحریر لوگوں کو سکھادی اور لوگوں کی گفتگو کو جو بُرے کلمات اور بدمحاورات اور ناپاک قسموں سے خراب ہورہی تھی درست کر دیا۔ [۸]

سرسیّد نے'' تہذیب الاخلاق'' کا انگریزی نام'' محمڈن سوشل رِفارمر'' رکھا۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سے مسلمانوں کی سماجی تہذیب چاہتے تھے۔ ہمیں یہ رسالہ اس دور میں اپنے فرائض انجام دیتا ہوا دکھائی بھی دیتا ہے۔ ''تہذیب الاخلاق''

کی اشاعت کا سلسلہ بوجوہ ٹوٹتا رہا۔پہلی بار یہ رسالہ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ کو شائع ہوکر ۲۰ ستمبر ۱۸۷۶ء تک چھپتا رہا۔ دوسری بار ۲۳ اپریل ۱۸۷۹ء ۲۸ جولائی ۱۸۸۰ء شائع ہوتا رہا۔ پھر مسلسل چودہ سال تک یہ رسالہ نہیں چھپ سکا، یہاں تک کہ اس کے لیے ڈپٹی نذیر احمد کو یہ بار اپنے کندھوں پر اُٹھانا پڑا۔ انھوں نے۱۸۹۲ء میں ''ایجوکیشنل کانفرنس''میں اس رسالے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اسے ایک بار پھر شائع کرنے کی تجویز دی اور زور دیا کہ ان کی اس تجویز پر مسلمانان ہند کی ذہنی آبیاری کے لیے عمل کرنا بے حد ضروری ہے۔''تہذیب الاخلاق'' کی اشاعت کس قدر کٹھن معاملہ تھی اس بات کا اندازہ ہم اس کے بار بار بند ہونے اور آخری بار ڈپٹی نذیر احمد کی تجویز کے بعد بھی دو برس تک تاخیر کا شکار ہوجانے سے لگا سکتے ہیں۔آخرِ کار ۷ اپریل۱۸۹۴ء کو ایک بار پھر اس کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا لیکن ۲ فروری ۱۸۹۷ء کو یہ سلسلہ اپنے دائمی انجام کو جا پہنچا۔اس رسالے کو کامیاب بنانے میں اس وقت جید علما نے عملاً اس میں حصہ لیا،مگر یہ مشن مالی اسباب کی جس قوتِ مسلسل کا متقاضی تھا' اُس کے نہ ہونے سے یہ جاری نہ رہ سکا۔

سرسیّد کو اسلامیانِ ہند کے بگڑتے ہوئے اخلاق و اَطوار کا شدید احساس تھا۔وہ جس زمانے میں زندہ تھے اس کا بھرپور ادراک رکھتے تھے اور اپنی معاشرت کے اتار چڑھاو سے بھی خوب واقف تھے۔سرسیّد کی تحریک کو ان کی شخصیت کی طرح ،کئی حوالوں سے دیکھا جا سکتا ہے کہ' کس کس میدان میں اس تحریک نے اپنے اثرات مرتب کیے ۔ ان میں پہلا حصہ وہ ہے ،جس میں سرسیّد اپنے رفقا سمیت مذہبی اصلاح کرنے اور اسے دور جدید کے مطابق قابلِ قبول بناتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ مذہب کے وہ تمام معاملات جو بنیادی اعتقاد کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی مذہب میں بنیادی ایمانیات سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکے تھے' سرسیّد نے ان اعتقادات کی بہتر تشریح پیش کی تھی ، مذہبی گروہ شیعہ اور سنی میں منقسم تھے ۔ظہور مہدی ایک اہم عقیدہ تھا جو آج بھی موجود ہے اسے تحقیق کی سائنسی بنیادوں پر انھوں نے ثابت کیا کہ یہ عقیدہ خالصتاً سیاسی دور سے ہے ۔ اسی طرح انھوں نے وحی سے لے کر فرشتوں ،جنت ،دوزخ ،موت اور بعد کی زندگی کو بھی موضوعِ بحث بنایا۔

دوسرا رُخ ان کی سماجی تحریروں کا ہے جن میں انھوں نے سیاست سے لے کر افراد کی امید پرستی کو موضوع بنایا اور باوَر کروایا کہ معاشرے میں ترقی کے لیے کیا ضروری رویّے اختیار کرنے چاہییں ۔ ان رَویوں کی تبدیلی کا خیال محض سرسیّد کا ایک ذاتی خیال نہیں تھا بلکہ اس کے در پردہ ،ان کا دیگر قوموں کی زندگیوں اور تہذیبوں کا باریک بینی سے مشاہدہ تھا جس کے نتائج کے حصول کے لیے وہ ایسے رویے ّہندستان کی معاشرت میں بھی دیکھنے کے خواہش مند تھے ۔اِس حوالے سے انھوں نے جو تحریریں لکھیں اور انھیں اپنے رسائل سے لوگوں تک پہنچایا ان میں تجاویز ہی نظر آتی ہیں کہ؛ ترقی کس طرح ممکن ہے۔قوموں کی کاہلی کس طرح انھیں تباہی کی طرف لے جاتی ہے' کامیابی' امید پرستی اور محنت میں کیوں کر پنہاں ہے ۔

اسی طرح تیسرا رُخ سرسیّد اوران کی تحریک کا ایسا ادب تخلیق کرنا تھا جس کو پڑھ کر اسلامیانِ ہندان تمام مقاصد کو حاصل کرسکیں جن کی خواہش سرسیّد لیے ہوئے تھے ۔اسلامیانِ ہند بھی اتنی بدحالی کے بعد خوش حالی کے خواہاں تھے لیکن راستہ انھیں سرسیّد کی تحریروں سے سجھائی دیا۔سرسیّد کی شخصیت میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو کسی بھی راہنما میں ہونی ضروری ہیں ۔مثلاً : قربانی اور ایثار کا جذبہ ،اَن تھک محنت ، صِدقِ دل سے اور مستحکم قدموں سے منزل کی جانب سفر ، راستے کی مشکلات کا ادراک اور ایک بے لوث خدمت کا جذبہ جو صرف قوم کی بدحالی کے درد سے ہی پیدا ہوتا ہے ۔ یہ تمام اَوصاف سرسیّد کی شخصیت میں موجود تھے ۔

سرسیّد کے ذہنی اِرتقا میں دِلّی کالج کا بھی حصہ ہے جس کی عملی اور علمی فضا نے انھیں زندگی کے کئی کھرے کھوٹے پہنچاننے میں مدد کی ۔یہیں انھیں ڈاکٹر اشپرنگر اور مسٹر کارگل کی قربت میسر آئی۔ ان باکمال لوگوں کی صحبت نے بھی سرسیّد کی قلبی اور فکری حالت کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا ۔ سائنٹفک سوسائٹی غازی پور، اور کئی انگریزی کتابوں کے تراجم بھی اسی علمی فضا کی عطا ہیں۔ سرسیّد کا تعلق دِلّی کالج سے بطور طالب علم تو کبھی نہیں رہا تھا' البتہ مذکورہ لوگوں سے رابطے اور علمی رِشتے سے انھوں نے خوب اِستفادہ کیا۔

سرسیّد کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا اور ہندستان کا مذہبی کلچر بحث مباحثہ اور مناظرے کا تھا' جس میں لوگوں کی ذہنی قابلیت انھیں لایعنی بحثوں سے پیدا ہوکر انھیں کی نذر ہوجاتی تھی۔ ایسی فضا میں اور ایسے مذہبی ماحول میں سرسیّد کا پیدا ہونا ایک غیر معمولی واقعہ ہے ۔اس معاشرے میں مذہبی معاملات کو معروضی انداز میں دیکھنے کی مطلقاً عادت نہ تھی ۔ اس حالت میں سرسیّد نے اسلامیانِ ہند کو ایک نئے انداز سے اور پرامن رہتے ہوئے سوچنے پر اکسایا ۔ اسلامیانِ ہند پر سرسیّد کے احسانات تو بہت ہیں' لیکن اگر ان کے استدلال کے رویّے پر ہی غور کر لیا جائے تو ہمیں ہندستان کی فکری فضا' قبل از نوآبادیاتی نظام اور مابعد تحریک علی گڑھ' یکسر مختلف دِکھائی دیتی ہے۔ یہ سرسیّد کا اس خطے میں بسنے والی قوموں کی ذہنی ترقی میں حصہ ہے' جنوبی ایشیا میں آج 'اگر کہیں منطقیت اور استدلال (Rationalism) دکھائی دے رہا ہے تو اس کو تحریک علی گڑھ اور سرسیّد کی اعلیٰ شخصیت سے جوڑ کر دیکھنا چاہیے۔ وہ فکری گروہ جو سرسیّد کو منفی انداز سے دیکھنے کے عادی ہیں' انھیں ایک نظر' ۱۸۵۷ء کی تاریخ کو بغور دیکھ لینا چاہیے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ سرسیّد ایک عالم تھے جنگجو اور حملہ آور جتھے کے سربراہ نہیں۔ جن مزاحمت کاروں نے انگریز کی طاقت سے ٹکرا کر اپنا حصہ اس ملک اور قوم کی آزادی میں ڈالا وہ بھی بہت عظیم سپوت تھے لیکن سرسیّد نے جو عملی اور علمی خدمات سرانجام دیں' آج اُن کی درست تعبیر کی بہت ضرورت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ باری علیگ' **کمپنی کی حکومت**' لاہور: نیا اِدارہ' ۱۹۶۹ء' ص ۳۹۶

۲۔ ایضاً' ص ۳۹۷

۳۔ سرسیّد احمد خان' ہماری تعلیم ہماری زبان میں' مشمولہ' مقالاتِ سرسید حصۂ ہشتم' لاہور: مجلس ترقی ادب' ۱۹۹۱ء' ص ۳۸

۴۔ سرسید احمد خاں' **مضامینِ سرسیّد**' مرتبہ: محمد اکرام چغتائی' اِمام اور اَمامت' لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز' ۲۰۰۸ء' ص ۱۶۴

۵۔ سرسید احمد خان' مقالات سرسید جلد دَہم ' لاہور: مجلس ترقی ادب' ۱۹۹۲ء' ص ۳۵/ ۳۸

۶۔ ایضاً' ص ۸۶

۷۔ ایضاً' ص ۹۷

۸۔ ایضاً' ص ۴۰/۴۱